”امیرِ تنظیمِ اسلامی کا پیش کردہ تصوّرِ فرائضِ دینی“

ایک جائزہ

(از قلم: مولانا الطاف الرحمٰن بنوی)

مولانا الطاف الرحمان بنوی صاحب کا یہ مقالہ دراصل اُسی موضوع سے متعلق ہے جو گذشتہ محاضراتِ قرآنی میں بالتفصیل زیرِ بحث آیا تھا یعنی ”امیرِ تنظیمِ اسلامی کے پیشکردہ تصورِ فرائضِ دینی کا تنقیدی جائزہ!“ — اس ضمن میں جیسا کہ قارئینِ ’حکمتِ قرآن‘ کے علم میں ہے، امیرِ تنظیمِ اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے تصوّرِ فرائضِ دینی پر مشتمل ایک مختصر تحریر مختلف مکاتیبِ فکر سے متعلق لگ بھگ یک صد علماء کو اس دعوت کے ساتھ ارسال کی تھی کہ وہ محاضراتِ قرآنی میں تشریف لا کر اس موضوع پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب کی دعوت پر جو علمائے کرام تشریف لائے ان میں ایسے علماء کی تعداد بہت کم تھی جنہوں نے اپنے خیالات کو باقاعدہ ایک مقالے کی شکل دی ہو۔ بہر کیف جو مقالات موصول ہوئے ان میں بھی اکثر و بیشتر جو تنقید سامنے آئی اس کا تعلق براہِ راست موضوعِ زیرِ بحث سے نہیں تھا بلکہ بعض ایسے ذیلی اشکالات سے تھا جو درحقیقت ارسال کردہ تحریر کی بعض عبارات میں پیدا شدہ ابہام کے باعث پیدا ہوئے تھے اور اس کا اصل سبب بھی یہ تھا کہ تحریر میں حد درجہ اختصار سے کام لیا گیا تھا۔ اور اجمالِ عبارت ہی درحقیقت ابہام اور اغلاق کا باعث بنا۔ چنانچہ اس نوع کے اشکالات میں سے اکثر کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف یہ کہ تحریری طور پر ’حکمتِ قرآن‘ (مئی ۸۵ء) کے صفحات میں توضیحات پیش فرما دی تھیں بلکہ محاضراتِ قرآنی سے متصلاً قبل خطبۂ جمعہ میں بھی اسی موضوع پر خطاب فرماتے ہوئے ممکنہ اشکالات کی وضاحت فرما دی تھی — مولانا الطاف الرحمٰن بنوی صاحب نے محاضرات میں جو مقالہ پیش فرمایا تھا اس میں بھی زیادہ تر گفتگو محاضرات کے اصل موضوع سے براہِ راست متعلق نہیں تھی بلکہ مولانا موصوف نے بھی محترم ڈاکٹر صاحب کی ارسال کردہ تحریر کی بعض عبارات اور الفاظ پر ناقدانہ تبصرہ فرماتے ہوئے بعض ذیلی اور ضمنی موضوعات ہی کو مرکزِ بحث بنایا تھا — چنانچہ بعد میں محترم ڈاکٹر صاحب نے مولانا موصوف کے ساتھ اپنے خصوصی تعلق کی بنیاد پر گذارش کی کہ وہ نہ صرف یہ کہ محترم ڈاکٹر صاحب کی پیشکردہ توضیحات کی روشنی میں اپنے مقالے پر نظرِ ثانی فرمائیں بلکہ براہِ راست محاضرات کے اصل موضوع یعنی ”امیرِ تنظیمِ اسلامی کے پیشکردہ تصورِ فرائضِ دینی“ کو بحیثیتِ مجموعی سامنے رکھ کر اس کے بارے میں

اپنی رائے اور تنقید کو بھی مقالے میں شامل فرمائیں ۔۔۔۔۔۔ ہم مولانا موصوف کے حد درجہ ممنون احسان ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی گذارش کا احترام کرتے ہوئے ہمیں حسب ذیل مقالہ ارسال فرمایا ہے

(ادارہ)

ایک اچھے اور سنجیدہ انسان کا کوئی بھی شعوری اور اختیاری عمل اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک کہ اس کی ضرورت کا سچا احساس پیدا نہ ہو اور سچا احساس پیدا ہونے کے لئے اس شئ کا صحیح علم و معرفت لابدی اور ناگزیر ہے ، گو یہ بھی ممکن بلکہ واقع ہے کہ کبھی کبھی کوئی ضرورت و احتیاج یا نرا دریافتی اشتیاق کسی سے ایک ایسا طویل اور کثیر المراحل عمل صادر کرا دیتا ہے جو پہلے سے اس کے سان و گمان میں بھی نہیں ہوتا اور اس طرح سے ہر عمل کے مسبوق بالعلم ہونے کا قاعدہ ٹوٹتا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے تاہم دقت نظر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں بھی گو پورے عمل کا تفصیلی خاکہ ذہن میں موجود نہیں ہوتا لیکن کام کا ہر وہ مرحلہ جو قوۃ سے فعل میں آجاتا ہے اپنے بعد والے مرحلے کا اجمالی علم و تصوّر فراہم کر دیتا ہے جو اقدام کا باعث بن جاتا ہے ۔

پھر کام جتنا بڑا ہوگا احساس میں شدّت و گہرائی اور علم میں صحت و قطعیت کی مقدار اتنی ہی بڑی ہونی ضروری ہے ورنہ ہلکا احساس یا ظنّی علم بڑے کام کو اوّلاً تو شروع کرنے نہیں دیتا اور اگر شروع کر بھی لیا جاوے تو کسی نہ کسی طور اس کے اتمام و تکمیل کو متأثر کر ہی دیتا ہے

اعلائے کلمۃ الحق کی جد و جہد اس دنیا کا سب سے عظیم کام ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو اس کائنات کی سب سے قیمتی شئے یعنی انسانی زندگی کا حقیقی مصرف قرار دیا گیا ہے ۔ لہٰذا اس عظیم کام سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک بہت ہی بھاری احساس کی ضرورت ہے اور یہ احساس اس جد و جہد کے اہداف کا واضح اور قطعی علم ہونے کا نتیجہ ہو سکتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرماوے تنظیم اسلامی کے امیر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کہ انہوں نے " تصوّر فرائضِ دینی " کے عنوان سے متذکرہ بالا اہداف اور ان کے لوازم کا ایک بہت ہی جامع خاکہ امّت کے سامنے پیش کیا ہے جو بہت تفصیلی ہونے کی وجہ سے انتہائی واضح بھی ہے اور قرآن و حدیث پر مبنی ہونے کی بدولت بلاشبہ حتمی و یقینی بھی ہے ۔

قرآن و حدیث پر غور کرنے والا کوئی بھی صحیح الفکر انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ محض تفنّن یا تسہیل و تیسیر کی خاطر تعبیرات و اسالیب میں کتنی ہی گوناگونی روا کیوں نہ رکھی جائے یا انضمام و انشعاب کے نتیجے میں ان کی مقدار و تعداد میں کتنی ہی کمی و بیشی تسلیم کیوں کی جائے فی الواقع انسان

کے دینی فرائض اور ان کے لوازم یہی اور اتنے ہی ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کئے ہیں جن میں سے سہ گانہ فرائض اور دوگانہ لوازم تو محکمات کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ تیسرے لازم یعنی بیعت کی ایک خاص صورت میں آراء کے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔

فرائض دینی کی تثلیث کا مسئلہ تو اس قدر عام اور پھیلا ہوا ہے کہ قرآن و حدیث کے کسی بھی ترغیبی یا ترہیبی اسلوب کا کوئی بھی نص لے کر اس کا تجزیہ کیجئے مآل کار اس کا تعلق انہی وظائف ثلاثہ میں سے کسی ایک سے ظاہر ہو کر رہے گا۔ بھلا! جو شخص ادیان و شرائع سماویہ کے موضوع بحث ـــــ جس کی ایک تعبیر تعمیر انسانیت سے بھی کی جا سکتی ہے ـــــ کے حقیقی مفہوم کا واقعی ادراک رکھتا ہو اور پھر فرائض ثلاثہ کے ان عنوانات کی معنویت اور جامعیت سے بھی نابلد نہ ہو جو ڈاکٹر صاحب نے قائم کئے ہیں اس کو اس تثلیث کی صحت و صداقت میں شک و شبہ ہو کیسے سکتا ہے۔ باقی رہی ان فرائض ثلاثہ کی ترتیب تو گو تضمین و تلمیح کے طور پر تو دسیوں نصوص سے اس کا استخراج و استنباط ممکن ہے لیکن تفصیل و صراحت کے ساتھ قرآن و حدیث میں اس کا مذکور ہونا معلوم نہیں تاہم پیغمبر اسلام کے مرحلہ دار جدوجہد اور اجتماعی انسانی نفسیات کے حاصل مطالعہ اور کئی دوسرے گوشوں سے فکر و تدبر کا ایک حرفی اور دوٹوک فیصلہ یہی ہے کہ منشا راینددی کے علی الرغم جزدی اور غیر مشتری طریقے پر تھوڑی سی انفرادی اصلاح کا تھوڑا بہت کام ہو بھی جائے۔ ایک دور رس، ہمہ گیر اسلامی انقلابی کام کے لئے اس ترتیب سے ہرگز مخالف نہیں۔

جو شخص اپنی تشکیل سیرت اور اصلاح کردار سے غافل و بے پرواہ مختلف اخلاقی کوتاہیوں سے داغدار ہو اس کی دعوتی اور تبلیغی پروگراموں کی ناکامیوں پر ہماری تاریخ کے بے شمار انتہائی تلخ تجربات کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری عقلی یا نقلی دلیل پیش کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تاہم تذکیر و تنبیہ کے طور پر اتنا سا اشارہ کرنا بے موقعہ و نامناسب نہیں ہے کہ ایسا شخص اس سوز و گداز اور اضطرابی کیفیت ہی سے محروم ہوتا ہے جو لوگوں کو متوجہ کرنے اور اپنی بات کو ان کے اعماق قلوب میں اتارنے کے لئے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے اور جب تک ذہنی رسوخ اور دلجمعی کا یہ مرحلہ سر نہ ہو، ہوا و ہوس کے لحمی شحمی انسانی مجسموں کو اقامت دین کے صبر آزما اور جانگسل مجاہدوں پر آمادہ کرنے کی امید رکھنا وہ خام خیالی اور پریشان خوابی ہے جس کی لاحاصلی روز روشن کی طرح عیاں و نمایاں ہے۔

اس دعوے کی تائید و توثیق اس بالکل تر و تازہ اور نقد صورت حال سے بھی ہوتی ہے کہ ہمارے

ہاں کی تبلیغی جماعت کی دعوتی سرگرمیاں بڑے بڑے علماء و فضلاء کی سرگرمیوں سے بھی نسبتاً زیادہ وسیع اور مؤثر ثابت ہو رہی ہیں جس کی سوائے اس کے اور کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی کہ جماعت کے اندر تعلیمِ فضائل کے ساتھ ساتھ تعمیلِ فضائل کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے جس کی برکت سے دلوں میں وہ انابت پیدا ہوتی ہے جس کے ظاہری آثار کا رنگ دوسروں کو بھی رنگین کر کے رہتا ہے۔ اور اب یہ بہت ہی تکلیف دہ حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ اس جماعت پر بھی حال پہ قال غالب آ رہا ہے۔ اور اگر اس کا بروقت تدارک نہ کیا جا سکا ولا فعلہا اللہ تو اس کا انجام بھی اس خانقاہی اور مدرسی نظاموں سے کچھ بھی مختلف نہ ہوگا جن میں سے ہر ایک اس وقت تک تو بہت قیمتی اور گرانقدر دینی خدمات انجام دیتا رہا ہے جب تک کہ اس کے اہل کار میں قول و فعل کی یکسانی باقی رہی لیکن جونہی ان کی بھاگ دوڑ ان عملی نامرادوں کے ہاتھوں میں آئی جو کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ فقط وراثت یا بخت و اتفاق سے ان کے جانشین ٹھہرے، تو دونوں کی تاثیر و کارکردگی بری طرح متأثر ہوئی اور اب حال یہ ہے کہ اوّل الذکر کا تو پرانے کھنڈرات یا تاریخی حکایات کے سوا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا اور ثانی الذکر اپنی روز افزوں وسعتوں کے باوجود قالبِ بے جان کا مصداق بنتا چلا جا رہا ہے۔

فرائضِ ثلاثہ پر عملدرآمد کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ان کے تین لوازم جہاد، جماعت اور بیعت کا ذکر فرمایا ہے جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے اوّل الذکر دو لوازم تو اس قدر اٹل اور محکم ہیں کہ اس میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں ۔ آپ جہاد کو سعی و کوشش کے وسیع لغوی مفہوم میں لیں کہ جس پر اکثر قرآنی و حدیثی اطلاقات کی بنا ہے پھر تو تینوں فرائض کا اس پر توقف بالکل ظاہر و باہر ہے کہ کسی فریضے کی ادائیگی بھی جہد و مشقت کے بغیر ممکن نہیں اور اگر اس کو قتال کے محدود فقہی معنی کے ساتھ خاص کر لیں اور یہ اصطلاح بھی بعض قرآنی و حدیثی استعمالات سے مأخوذ ہے۔ مثلاً:
یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ[1]: الجہاد ماضٍ الی یوم القیامۃ تو فریضۂ ثالث یعنی اقامتِ دین میں اس کا عمل دخل تو کسی ثبوت کا محتاج نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ کام اسلام کی سیاسی بالادستی کے بغیر ممکن نہیں اور سیاسی بالادستی کے لئے طاقت کا استعمال کرنا ہی پڑے گا۔ باقی رہے دین پر عمل کرنے اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کے دو فریضے، تو اوّلاً تو سیاسی بالادستی کے بغیر خود یہ دو فریضے بھی معرضِ خطر میں ہوں گے کہ یا تو غیر اسلامی سیاسی قاہر سرے سے مسلمانوں کے شخصی اعمال میں بھی آزادی کا قائل اور روادار نہ ہوگا اور یا کم سے کم غیر اسلامی معاشرے میں وہ مناسب فضا اور سازگار ماحول مہیا ہرگز نہ ہوگا جو ان

---

[1] بعض مفسرین نے "جَاھِدِ الْکُفَّارَ" کے بعد "بالسَّیْف" کے الفاظ محذوف مانے ہیں۔

فرائض کی ٹھیک ٹھیک بجا آوری کے لئے ضروری ہے اور ثانیاً اگر ان دو فرائض پر عمل کسی درجے میں ممکن بھی ہوا تو فریضۂ ثالث پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مجموعۂ فرائض سے سبکدوشی تو بہر حال سیاسی غلبے پر موقوف ہے ہی، سو قتال سے خلاصی کی کوئی سبیل نکل نہیں آتی ۔

ضرورتِ قتال کی یہ بحث تشنہ رہے گی اگر مندرجہ ذیل تین باتیں پیشِ نظر نہ ہوں۔ اولاً یہ کہ اقامتِ دین کی جدوجہد بھی ایسا ہی فرض اور ضروری ہے جیسے کہ شخصی اصلاح اور دعوت و تبلیغ کی جدوجہد بعض لوگوں کو دین کی اس بدیہی بات میں بھی شبہ ہے کہ واقعتہً اسلام کے سیاسی غلبے کی سعی و کوشش بھی مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے ۔ چنانچہ اس ذہنیت کے لوگوں کے ہاں قتال کی ضرورت میں کلام کرنے کی کافی گنجائش موجود ہے ۔ ثانیاً یہ کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں مسلسل توسیع اور افزونی مطلوب ہے ۔ یہاں تک اگر انسانی آبادی کا ایک بہت معمولی سا معلوم حصہ بھی اسلام کے اقتدار سے خارج ہے تو اس جدوجہد کا میدان باقی ہے ۔ ثالثاً یہ کہ اسلام اقتدارِ عامہ کے سوا کسی دوسری بات پر سمجھوتہ کرنے کا روادار ہرگز نہیں ۔

ان تینوں باتوں کے اثبات کے لئے سورۃ بقرہ کی آیت ۱۹۳ کا یہ حصہ بالکل کافی و شافی ہے

وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ

اہمیت و اولیتِ قتال پر جو عقلی جائزہ آپ کے سامنے آگیا ہے اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے اسی سورۃ بقرہ کی آیت ۱۹۵ کا یہ ٹکڑا وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ، بہت قابلِ لحاظ ہے، علامہ بیضاویؒ نے اس کی کئی تقدیروں کے ساتھ ایک تقدیر یہ بھی نکالی ہے اے بالکف عن الغزو والانفاق اور بلاشبہ سیاق و سباق کے لحاظ سے یہ تقدیر بہت عمدہ اور برمحل ہے ۔

قرآن و حدیث اور خیر القرون کے تاریخی مطالعے سے اسلام اور مسلمان کا جو حلیہ منتزع ہوتا ہے اس میں زندگی، حرکت اور وسعت پذیری کی جھلک بہت نمایاں ہے۔ اس حلئے میں مخصوص حالات کے سوا، جہاں بینی و جہاں بانی کی صفات کا ایسا غلبہ نظر آتا ہے کہ گویا یہی اس کے اصل عناصرِ ترکیبی ہیں کیا اس حلئے اور شخصیت کا اس کے بغیر تصور کیا جا سکتا ہے کہ جہاد اپنے دونوں مفہوموں سمیت اس میں سمویا ہوا ہو۔ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو ماننا پڑے گا کہ مسلمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں اور ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ۔

جہاد کے لئے التزامِ جماعت کی ضرورت میں تو عقلی طور پر کوئی نظر ہے ہی نہیں جو محتاجِ ثبوت ہو

صرف اطمینانِ خاطر کے لئے نقل کی تائید چاہیے سو اس سلسلے میں ان بے شمار نصوص سے صرف نظر کرتے ہوئے جو اس مدعا میں بالکل واضح اور صریح ہیں فقط ایک ایسی لطیف قرآنی اشارت پر اکتفا کی جاتی ہے جو تاثیر و دلالت میں کئی عبارتوں پر بھاری ہے۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ٥ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا تو اخراج و تخلیق ہی بوضع اُمّت و جماعت ہے اس وضع و ہیئت کے بغیر نہ صرف یہ کہ ان کی کوئی خیریت و فضیلت نہیں کہ یہی چیز تو وجہ خیریت یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضامن و متکفل ہے بلکہ سرے سے ان کا وجود ہی کالا وجود ہے۔

لوازم کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے تیسری اور آخری چیز بیعت ذکر کی ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی بھی شخص پر مخفی نہیں کہ مسلمانوں کا امیرِ جماعت دین و سیاست کے دونوں پہلوؤں کی مرکزیت کا جامع ہوا کرتا ہے۔ نبوّت اور اس کے بعد خلافت کی پوری مدّت میں یہی صورتِ حال رہی اور اس دور میں بھی جب کبھی اسلام کو بحیثیت دین غلبہ حاصل ہوا۔ امیر دونوں قیادتوں کا مرکز قرار پایا۔ یہ ہمہ جہتی مرکزیت کوئی قضیہ اتفاقیہ نہیں بلکہ اسلام کی رُو سے تشکیلِ جماعت اور تقسیمِ کار کا جو ضابطہ طے پایا اسی کے مطابق پورے شعور اور قصد و ارادے کے ساتھ ایسا کیا جاتا رہا۔

اسلام نے یہ طرزِ عمل کیوں روا رکھا، یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر مستند گفتگو کرنی ماہرینِ شریعت کا کام ہے۔ ہمیں تو صرف یہ کہنا ہے کہ اس کے نتیجے میں امیر کی ذمّہ داریوں میں بے حد اضافہ ہوا، ان بھاری ذمّہ داریوں کو نبھانے کے لئے راعی اور رعیّت کے مکمل ظاہری اور باطنی توافق کی ضرورت تھی کہ اس کے بغیر اپنے وزن کو امیر کے وزن میں ڈالنے اور جماعتی قوّت پیدا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور یہ توافق امیر کی ذات پر پورے اعتماد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اسی اعتماد کا اظہار و اعلان کرنے کے لئے بیعت کا طریقہ اپنایا گیا جو دورِ نبوّت و خلافت میں تو پورے زور و شور سے برابر جاری رہا اور اس کے بعد بھی ایک طویل زمانے تک کسی نہ کسی شکل میں باقی رہا۔

فی زمانہ انتخابِ امیر کے سلسلے میں جتنے بھی طریقے مروّج ہیں نفسیاتی طور پر بیعت کا طریقہ ان سب میں زیادہ پُر تاثیر اور پُر شکوہ ہے۔ نیز بیعت براہِ راست امیر کے ہاتھ پر ہو یا وسعتِ مملکت

اور کثرتِ آبادی کی بدولت مختلف اطراف و اکناف میں اس کے مقرر کردہ نائبین کے ہاتھ پر ہو، دھاندلی اور فریب کاری کی ان تمام صورتوں سے نسبتاً زیادہ مامون و محفوظ ہے جن سے آج کل کی غیر مستحق امارتیں بھرپور فائدہ اٹھاتی ہیں۔ بہر حال نبوّت و خلافت کے بعد جہاں بے شمار دوسرے ریاستی تقاضے پامال کئے جاتے رہے وہاں بیعت کا طریقہ بھی متروک ہوتا چلا گیا تا آنکہ آج ایسی باتیں بڑی ناگواری سے سُنی جاتی ہیں۔

بیعت کے اس نوع میں تو کسی بھی اہل علم کو اختلاف نہیں، سب جانتے اور مانتے ہیں کہ امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین کے انتخاب کا یہی طریقہ ماثور و محبوب ہے اور غالباً اس پر بھی اتفاق ہے کہ نظامِ خلافت ٹوٹنے اور عالمِ اسلام کا مختلف حصّوں میں بٹنے کے بعد بھی ہر سیاسی اکائی اور انتظامی یونٹ کا مسلمان سربراہ بیعتِ امارت کا مجاز ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی کو بھی ایسی بیعت (بیعتِ امارت) لینے کا حق حاصل نہیں، اختلاف فقط اس میں ہے کہ ایسی ہی کسی یونٹ میں بیعتِ جہاد لینی بھی ممنوع ہے یا نہیں۔ سو ایک فریق نے تو جہاد کو قتال کا ہم معنی سمجھ کر جھٹ سے اس بیعت کو ناجائز اور اس کے مرتکب کو گردن زدنی قرار دیا، ایسے لوگوں نے نہ صرف ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیم اسلامی کی مذمّت کی بلکہ تبلیغی جماعت کو بھی (بشمول کچھ دوسری وجوہ کے) اس وجہ سے تحقیر و تضحیک کا نشانہ بنایا کہ انہوں نے جہاد سے متعلق اکثر قرآنی و حدیثی فضیلتوں کو دعوت و تبلیغ کی جد و جہد پر بھی فٹ کیا ہے۔ اس اعتراض کا شافی جواب شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرّہٗ نے اپنی ایک جوابی تحریر میں دیا ہے جس پر اضافے کا امکان نہیں۔

ایک دوسرا فریق جہاد اور قتال کے فرق و تفاوت کو جانتے اور مانتے ہوئے بھی بیعتِ جہاد پر معترض ہے۔ اس فریق میں یہ کہنے والا تو شاید کوئی بھی نہیں ہوگا کہ غلبہ و اقامتِ دین کیلئے سرے سے جماعتی جد و جہد ہی غیر مشروع ہے ورنہ تو تنظیم اسلامی کی کیا تخصیص، پاکستان کی دوسری تمام دینی کہلائی جانیوالی سیاسی جماعتوں کی مساعی بھی نامشکور ہوں گی جس کا اصولاً کوئی بھی قائل نہیں، اب اعتراض کے لئے صرف یہی ایک بات رہ جاتی ہے کہ امارتِ کلیہ کے سوا کسی دوسری جزئی دینی محنت کے لئے بیعت کا شرعی ثبوت موجود نہیں ہے تو اس کا سہل جواب یہ ہے کہ عقبۂ اولیٰ و ثانیہ میں نبی علیہ السّلام کے ہاتھ پر انصار کی بیعت، بیعتِ امارت تھی؛ ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہے کہ امارت تو ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں منعقد ہوئی۔ ایک موقعہ پر بعض عورتیں بیعت کرنے کے لئے حاضر ہوئیں تو آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو بیعت فرمایا، سورۃ ممتحنہ آیت ۱۲ میں

یوں ارشاد ہے۔

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

واضح بات ہے کہ یہ بیعت بھی بیعتِ امارت نہ تھی بلکہ شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد، بہتان تراشی اور نیک کاموں میں نافرمانی سے اجتناب پر تھی، اسی طرح سے حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان خالصتاً جہاد بمعنیٰ قتال پر ہوئی، خلاصہ یہ کہ امارتِ کلیہ کے علاوہ بھی دین کے دوسرے جزئی امور پر بیعت امت کے اندر منقول و ماثور ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث علامہ نووی کی تشریح کے ساتھ پیشِ خدمت ہے جس سے اس مدعا پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

عَنْ ابی عثمانؒ اخبرنی مجاشع بن مسعود السلمی قال جئت باخی ابی سعید الی رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ عَلَیْہِ وسلّم بعد الفتح فقلت یا رسول اللّٰہ بایعہ علی الھجرۃ قال مضت الھجرۃ باھلھا قلت بای شئی بتابعہٗ قال علی الاسلام والجھاد والخیر:	مجاشع بن مسعود کہتے ہیں کہ میں اپنے بھائی ابوسعید کو آپ کی خدمت میں فتح مکہ کے بعد لے گیا اور عرض کیا یارسول اللہ ان سے ہجرت پر بیعت لے لیجیے، آپ نے فرمایا ہجرت تو مہاجرین پر ختم ہو چکی۔ میں نے عرض کیا پھر کس چیز پر آپ بیعت لیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: اسلام پر، جہاد پر اور نیک اعمال پر۔

علامہ نوویؒ نے اس کی شرح میں فرمایا، البتہ دوسری چیزوں یعنی امورِ خیر جہاد اور اسلام پر بیعت لی جاسکتی ہے۔ اور یہ چیزیں بجائے خود بڑی اہمیت اور خصوصیت کی حامل ہیں

حدیثِ بالا اور نوویؒ کی تشریح سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امورِ خیر پر بیعت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ مشروع و متوارث ہے۔ صوفیاء کا بیعت ارشاد اسی بنیاد پر استوار ہے جس کی کسی زمانے میں بھی کوئی معتد بہ مخالفت نہیں ہوئی ہے۔